صحابۂ حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے متعلق ایک نہایت اہم کام

اشاعت دین کا کام ہمیشہ جاری رہے گا

(فرمودہ ۱۹؍نومبر ۱۹۳۷ء)

تشہّد ،تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:-

ہمارے سلسلہ کو قائم ہوئے قریباً ۴۸ سال ہوگئے ہیں اور اب دو سال میں پچاس سال کی مدت ختم ہو جائے گی۔ انسانی زندگیوں کے لحاظ سے پچاس سال کی عمر ایک نہایت ہی پختہ عمر ہوتی ہے اور پچاس سال کے آدمی بڑھاپے کی طرف جا رہے ہوتے ہیں گورنمنٹ بھی اپنے ملازموں کو ۵۵ سال کی عمر میں پنشن دے دیتی ہے۔ پس جو دعویٰ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے کیا تھا اُس کے ابتدائی حالات دیکھنے اور سننے والوں میں سے نَوعمروں کی عمر اگر ۱۸، ۲۰ سال یا پندرہ سال بھی سمجھ لی جائے ، کیونکہ یہ چھوٹی سے چھوٹی عمر ہے جس میں بچہ کچھ سمجھدار ہو جاتا ہے (یہ تو نہیں ہوسکتا کہ جو لوگ ایمان لائے وہ سب کے سب پندرہ برس کے ہی تھے۔ اُن میں تو پندرہ برس کا شاید ہی کوئی ہو ورنہ ایمان لانے والے بِالعموم ۲۵، ۳۰ سال کی عمر کے لوگ تھے)۔ تو وہ پندرہ سال کا بچہ آج ۶۳ سال کا ہوگا اور جس کی بیس سال کی عمر تھی وہ آج ۶۸ برس کا ہوگا اور جس کی اُس وقت تیس سال عمر تھی وہ آج ۷۸ برس کا ہوگا۔ اور ۷۸ سال کی عمر وہ ہے جس کو ہمارے ملک کے لوگ بہت کم پہنچتے ہیں اس لحاظ سے سمجھ لینا چاہئے کہ اس

وقت ابتدائی بیعت دیکھنے والوں میں سے ایک دو ہی زندہ ہوں گے اور بظاہر حالات دو چار سال کے بعد کوئی بھی ایسا شخص باقی نہیں ہوگا جس نے ابتدائی حالات کو دیکھا ہو۔ پھر ابتدائی بیعت کے بعد ابتدائی مشکلات کا زمانہ تھا جو ۱۹۰۰ء تک سمجھنا چاہیئے۔ اگر اُس زمانہ کو ۱۸۹۵ء تک بھی سمجھا جائے تو اس کے دیکھنے والوں کی عمر بھی اگر وہ اُس وقت بیس سال کے تھے آج ۶۲ سال کی ہوتی ہے۔ اور اُس زمانہ کے آخری سال یعنی ۱۹۰۰ء کو اگر لیا بھی جائے تو بیس سال کی عمر کا آدمی اب ۵۷ سال کا ہوا۔ اور اگر پندرہ برس کی عمر والے بھی شامل کر لئے جائیں تو گویا ایسے لوگ اب ۵۲ سال کی عمر کو پہنچ چکے ہوں گے۔ غرضیکہ اُس زمانہ کے لوگ یا تو فوت ہو چکے ہیں یا وفات کے قریب ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی وفات ۱۹۰۸ء کے ابتدا میں ہوئی اور اُس وقت جن لوگوں کی عمر پندرہ سال کی سمجھی جائے کیونکہ یہی کم سے کم عمر ہے جس میں بچہ سمجھ رکھتا ہے تو ایسے لوگوں کی عمر بھی اب ۴۴ سال ہوگی۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ ایسے لوگ بھی زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس سال اور جماعت میں رہ سکتے ہیں اور بظاہر آج سے ۲۰، ۲۵ سال بعد شاید ہی کوئی صحابی جماعت کو مل سکے۔ ایسے صحابی جس نے حضور کی باتوں کو سُنا اور سمجھا ہو۔ یوں تو ایسے بچے بھی صحابی ہو سکتے ہیں جن سے جبکہ وہ دو چار سال کی عمر کے ہوں، حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے باتیں کی ہوں۔ یہ عمروں کا اندازہ میں نے وہ کیا ہے جو عام طور پر ہوتا ہے۔ بعض لوگ غیر معمولی طور پر لمبی عمریں بھی پاتے ہیں۔ جس دن میں نئے مہمان خانہ کی بنیاد رکھ کر آیا مجھے رستہ میں ایک بوڑھے آدمی ملے۔ ان کی شکل حافظ غلام رسول صاحب وزیر آبادی سے اِس قدر ملتی جلتی تھی کہ میں نے انہیں دیکھتے ہی کہا کہ کیا آپ ان کے رشتہ دار ہیں؟ انہوں نے کہا میں ان کا چچا ہوں۔ ان کے چہرے سے جس قسم کی طاقت ظاہر ہوتی تھی اُس سے اندازہ کر کے میں نے قیاس کیا کہ یہ غالباً ان سے چھوٹے ہیں۔ بعض اوقات بھتیجے کی عمر چچا سے زیادہ بھی ہوتی ہے اس لئے میں نے ان سے دریافت کیا کہ کیا آپ حافظ صاحب سے چھوٹے ہیں؟ تو انہوں نے اپنی مخصوص زبان میں جواب دیا کہ ''جدوں اُس دی ماؤ دا ویاہ ہویا سی اودوں میں اٹھارہ وریاں دا ساں''۔ یعنی جب ان کی والدہ کی شادی ہوئی اُس وقت میری عمر اٹھارہ برس کی تھی۔ حافظ صاحب کے قویٰ بھی مضبوط تھے۔ اب تو بیماری کی وجہ سے وہ کمزور ہو گئے ہیں لیکن بیماری سے پہلے ہم ان کو مضبوط قویٰ کے آدمیوں میں سے سمجھا کرتے تھے۔ لیکن پھر بھی اپنے چچا سے ان کا کوئی جوڑ ہی نہیں اور ان کے چچا نے کہا کہ آپ مجھے کمزور خیال نہ کریں۔ اب بھی میں

دس بارہ میل پیدل سفر کر لیتا ہوں اور میری عمر اِس وقت ۹۸ سال کی ہے اور حافظ صاحب کی ۸۷، ۹۷ سال۔ تو ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں۔

ایک اور مثال بھی مجھے یاد آ گئی۔ پندرہ سولہ سال ہوئے ایک دوست بیعت کرنے کی غرض سے میرے پاس آئے اور کہا کہ میں لاہور سے پیدل آیا ہوں۔ میں نے ان کی شکل وصورت سے اندازہ کر کے کہا کہ آپ کی عمر تو ساٹھ ستر سال کی ہوگی۔ آپ نے بڑی ہمت کی جو اس قدر لمبا سفر پیدل کیا۔ مگر وہ کہنے لگے کہ میری عمر تو ایک سَو دس سال کی ہے۔ میں جس اُستاد کے پاس پڑھا کرتا تھا ان کے پاس ایک دفعہ مہاراجہ رنجیت سنگھ آئے تھے (مہاراجہ رنجیت سنگھ صاحب کو فقراء سے بہت عقیدت تھی اور وہ مُسلم فقراء کے پاس بھی جایا کرتے تھے تاکہ ان سے دعا کرائیں) اور ان کو ایک بھینس دی تھی جسے میں نہلاتا تھا۔ تو انہوں نے اپنی عمر ایک سَو دس سال یا شاید اس سے بھی زیادہ بتائی تھی۔ بعد میں مَیں سمجھا کرتا تھا کہ وہ شاید فوت ہو چکے ہیں۔ مگر کوئی ایک سال کا عرصہ ہوا ایک دوست کا خط آیا جس میں ان کے متعلق بھی لکھا تھا کہ ان کی عمر اب ۱۳۰، ۱۳۵ سال کے لگ بھگ ہے اور وہ آپ کو اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ کہتے ہیں۔ تو ایسے استثنائی لوگ بھی ہوتے ہیں۔ صحابہ میں سے حضرت انسؓ نے سب سے بڑی عمر پائی اور وفات کے وقت وہ ۱۱۰ یا ۱۲۰ سال کے تھے۔[۱] رسول کریم ﷺ کی وفات کے وقت ان کی عمر ۱۷، ۱۸ سال تھی اور آپ کی وفات کے بعد وہ قریباً سَو سال زندہ رہے۔ ایسے لوگ تو تبرکات ہوتے ہیں جن کو دیکھنے کیلئے اگر دنیا کے دوسرے کنارے سے بھی آنا پڑے تو یہ مشقت کم ہے اور ایسے لوگوں کو تو اللہ تعالیٰ دوسروں کو تابعیت کا فضل دینے کیلئے زندہ رکھتا ہے تا لوگ ان کی وجہ سے تابعی کہلا سکیں۔ ورنہ عرب میں عمریں بِالعموم ساٹھ اور ستّر سال کے درمیان ہوتی ہیں۔ رسول کریم ﷺ نے بھی اپنے زمانہ کی اوسط عمر ساٹھ سال ہی فرمائی ہے اور ساٹھ سال کی اوسط عمر بہت بڑی عمر ہے۔ ہمارے ملک کی اوسط عمر گورنمنٹ کی مردم شماریوں کے رو سے تیس سال نکلتی ہے۔ انگلستان کی اوسط عمر ۴۸ سال ہے اور سمجھا یہ جاتا ہے کہ وہاں کے لوگ لمبی عمریں پاتے ہیں۔

پس میں جس عمر کا ذکر کرتا ہوں وہ لمبی عمروں میں سے اوسط عمر ہے اور جس حدیث کا میں نے ذکر کیا ہے اس کا مفہوم غالباً عام عمروں میں سے اوسط عمر ہے۔ کیونکہ انفرادی طور پر تو اس زمانہ میں بھی سَو سال سے زیادہ عمریں بعض لوگوں نے پائی ہیں۔ اب اوسط کے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ جس قوم کی

اوسط عمر ساٹھ سال ہو وہ اعلیٰ درجہ کی تندرست قوم تھی۔ ورنہ ہمارے ملک میں تو پچاس فیصدی لوگوں کا بھی اس عمر کو پہنچنا ناممکن ہے۔انشورنش والے انسانوں کی عمروں کے اعداد وشمار نکالتے رہتے ہیں اور ان کا اندازہ ہے کہ صرف پندرہ فیصدی لوگ ساٹھ سال یا اس سے اوپر پہنچتے ہیں۔ان حالات میں ۱۵۔۲۰ سال کے بعد ہماری جماعت میں صحابیوں کا ملنا مشکل ہوگا۔مگر ہم نے ابھی تک وہ علوم دنیا میں قائم نہیں کئے جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ذریعے ملے تھے۔صحابہ کرام کو اِس کا اِس قدر جنون تھا کہ وہ جب بھی بیٹھتے کہتے آؤ رسول کریم ﷺ کی باتیں کریں اور انہوں نے آپ کا کھانا پینا، بیٹھنا اُٹھنا، سونا جاگنا غرضکہ آپ کی ہر قسم کی حرکات وسکنات کو اس طرح محفوظ کر دیا کہ آج بیسیوں کتابیں احادیث اور تاریخ کی بھری پڑی ہیں۔تاریخ کی دس دس اور پندرہ پندرہ جلدوں کی باریک لکھی ہوئی بیسیوں کتابیں موجود ہیں اور احادیث کی کتابیں ان کے علاوہ ہیں۔احادیث کی کئی کتابیں تلف بھی ہو چکی ہیں۔اگرچہ ان میں درج شدہ حدیثیں احادیث کی دوسری کتابوں میں یا تفاسیر میں آ گئی ہیں۔میں سمجھتا ہوں رسول کریم ﷺ کی زندگی اور سیرت کے حالات کی کتابیں اور احادیث اگر جمع کی جائیں تو تین چار سَو ضخیم جلدیں تیار ہوسکتی ہیں۔جن میں سے ہر ایک جلد پانسو صفحات کی ہو۔اگر ایسی تین سَو جلدیں بھی ہوں تو یہ ڈیڑھ لاکھ صفحات ہوں گے اور جتنے بڑے صفحات عام طور پر عربی کی کتابوں کے ہوتے ہیں وہ انسان ایک گھنٹہ میں دس بارہ پڑھ سکتا ہے۔روزانہ چھ گھنٹہ کی پڑھائی رکھی جائے تو دن میں ستّر صفحات کی اوسط بنتی ہے اور ایک مہینہ میں دو ہزار ایک سَو صفحات کی اور ایک سال میں پچیس ہزار صفحات کی۔گویا سب کام چھوڑ کر بھی ایک آدمی کا چھ سال پڑھنے کے بعد ان کتب پر عبور ہوسکتا ہے۔لیکن چونکہ انسان کو کتاب کے سمجھنے کیلئے کبھی غور کی ضرورت ہوتی ہے، کبھی دوسری کتب کے مطالعہ کی، کبھی لُغت کی اس لئے درحقیقت وقت اِس سے دوگنا بلکہ تگنا خرچ ہوتا ہے۔یہ تو عام لیاقت کے آدمیوں کا حال ہے۔لیکن جو لوگ تیز پڑھنے والے ہیں اور زیادہ محنت کر سکتے ہیں ان کے لحاظ سے بھی سرسری تلاوت پر تین سال اور غور کر کے اور سمجھ کر پڑھنے پر چھ سال سے نو سال خرچ ہوتے ہیں بشرطیکہ وہ اور کوئی کام نہ کریں۔غرض صحابہ کرام نے اتنا ذخیرہ چھوڑا ہے کہ آج ہمیں بہت ہی کم یہ خیال آسکتا ہے کہ کاش! رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فلاں بات ہمیں معلوم ہوتی۔مگر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے حالات، اقوال اور واردات کا بہت ہی کم حصہ محفوظ ہوا ہے۔

میں نے بارہا دوستوں کو توجہ دلائی ہے کہ جو بات کسی کو معلوم ہو وہ لکھا دے اور دوسروں کو سنا دے۔ مگر افسوس کہ اس کی طرف بہت ہی کم توجہ کی گئی ہے۔ اور اگر کسی نے توجہ کی بھی ہے تو ایسی طرز پر کہ اس کا نتیجہ صفر کے برابر ہے۔ پس گو میرا آج کا مضمون تو اَور ہے مگر ضمنی طور پر میں دوستوں کو بِالخصوص نظارت تالیف وتصنیف اور تعلیم کو توجہ دلاتا ہوں کہ یہ اس قسم کا کام ہے کہ اس میں سے بہت سا ہم ضائع کر چکے ہیں اور اس کیلئے ہم خدا کے حضور کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ اب جو باقی ہے اسے ہی محفوظ کرنے کا انتظام کیا جائے۔ ہمارا سالانہ بجٹ تین لاکھ کا ہوتا ہے مگر اس میں ایک ایسا آدمی نہیں رکھا گیا جو ان لیکچروں اور تقریروں کو جو صحابہ کریں قلمبند کرتا جائے۔ اب بھی اگر ایسا انتظام کر دیا جائے تو جو کچھ محفوظ ہوسکتا ہے اسے کیا جا سکتا ہے۔ اور اس میں سے سال دو سال کے بعد جو جمع ہو شائع ہوتا رہے اور باقی لائبریریوں میں اور لوگوں کے پاس بھی محفوظ رہے۔ میں سمجھتا ہوں اب بھی جو لوگ باقی ہیں وہ اتنے ہیں کہ ان سے چالیس پچاس فیصدی باتیں محفوظ ہوسکتی ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک بہت بڑے مصنف بھی تھے۔ اس لئے آپ کی کتابوں میں بھی بہت کچھ آ چکا ہے۔ لیکن جو باتیں صحابہ کو معلوم ہیں اگر ان کو محفوظ کرنے کا کوئی انتظام نہ کیا گیا تو ہم ایک ایسی قیمتی چیز کھو بیٹھیں گے جو پھر کسی صورت میں بھی ہاتھ نہ آ سکے گی۔ میں کئی سال سے اِس امر کی طرف توجہ دلا رہا ہوں مگر افسوس ہے کہ ابھی تک اِس کی اہمیت کو نہیں سمجھا گیا۔

میں اپنے اِس درد کی وجہ سے جو اِس بارہ میں میرے دل میں ہے کہیں سے کہیں نکل گیا۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ ہمارے لئے ایک بہت نازک دَور آ رہا ہے۔ ایک عظیم الشان کام ہمارے سپرد کیا گیا تھا لیکن ہم ابھی تک اس محل کی بنیادوں کے خاتمہ اور ڈیوڑھی تک بھی نہیں پہنچے جس کی تعمیر اور جس کی آبادی ہمارے ذمہ فرض تھی۔ اس کی تعمیر کے لحاظ سے تو کہنا چاہئے کہ ہم ابھی تک اس کی بنیادیں بھی نہیں بھر سکے اور آبادی کے لحاظ سے ابھی اس کی ڈیوڑھی تک بھی نہیں پہنچے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل کبھی کبھی ہمیں جگاتے اور ہوشیار کرتے ہیں مگر ہم پھر غفلت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے ایک فضل نے مجھ سے تحریک جدید کو جاری کرایا جس کی غرض بھی ہمیں ہوشیار کرنا تھا۔ تحریک کے اصل معنے حرکت دینے کے ہیں اور اس نام سے میری مراد یہی تھی کہ جماعت کو بیدار کیا جائے یہ نہیں کہ جماعت کو کوئی نئی چیز دی جائے۔ علم رسول کریم ﷺ پر ختم ہو چکا ہے۔ کسی ماں نے اب

ایسا بچہ نہیں جننا جو رسول کریم ﷺ کے لائے ہوئے علم میں ایک شوشہ کا بھی اضافہ کر سکے یا اس میں کمی کر سکے۔ ہاں اس کے شارح ہوتے رہیں گے جو اسی کی تفاسیر کرنے والے ہوں گے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی اِسی علم کی تفسیر ہی کی اور ہم بھی اب یہی کر رہے ہیں۔ آج فضیلت کا معیار یہی ہے کہ علوم کے اس خزانہ میں سے کس پر کتنا ظاہر کیا جاتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی فضیلت کی یہی وجہ ہے کہ اس علم کا خزانہ بعد رسول کریم ﷺ کے سب سے زیادہ آپؑ پر کھولا گیا۔ پس ہم میں سے ہر ایک کی بڑائی اسی میں ہے کہ اس پر وہ دروازہ کتنا کھولا جاتا ہے۔ قرآن کریم کو تصنیف تو نہیں کہا جا سکتا لیکن اگر ہم تمثیلی طور پر ایسا کہہ لیں تو کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی تصنیف محمد رسول اللہ ﷺ پر ختم ہو گئی۔ اب جو بھی آئیں گے وہ اس کے شارح ہوں گے اور اسی کی تشریح کرتے جائیں گے۔ تحریک جدید بھی اسی کی ایک تشریح ہے، کوئی نئی چیز نہیں۔ عربی میں حرک کے معنے ہیں ہلانا، بیدار کرنا اور اسی لحاظ سے اس کو تحریک جدید کہا گیا تھا کہ یہ جماعت کو بیدار کرنے اور جگانے کیلئے تھی۔

آج اس تحریک پر تین سال کا عرصہ گزر گیا ہے اور میں نے پہلے اعلان میں کہا تھا کہ یہ ابتداءً تین سال کیلئے ہے مگر وصالِ الٰہی، استحکامِ دین اور اشاعت اسلام کا کام تین سال سے نہیں بلکہ عمروں کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ اور کوئی شخص جس دن اس کام کو ختم سمجھے وہی اس کی تباہی کا دن ہے۔ جس دن کوئی یہ خیال دل میں لائے وہی دن اس کے تنزّل کا ہوتا ہے۔ جب مسلمانوں نے یہ سمجھا کہ دین کا کام پورا ہو گیا ہے، اسی دن وہ تباہی، ذلّت، نکبت اور ادبار کے گڑھے میں گرنے لگے۔ جب تک مسلمان یہ سمجھتے رہے کہ یہ کام مکمل نہیں ہوا اور ہم نے اس کی تکمیل کرنی ہے، اُس وقت تک وہ برابر ترقیات کا کام کرتے رہے۔ ہم نے دنیا میں قرآن کریم کو قائم کرنا ہے اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں لاتعداد خزانے ہیں تو ہم میں سے جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ قرآن کریم کو قائم کرنے کا کام ختم ہو گیا اس سے زیادہ پاگل کون ہو سکتا ہے۔ بارش ہونے کے بعد جو شخص یہ کہے کہ اب ہمیشہ کیلئے بارش ہو چکی تو اسے پاگل کہا جائے گا۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اِس وقت جو بادل آئے تھے وہ برس چکے ہیں اور جب خدا تعالیٰ کے بادل ختم نہیں ہوتے ہر روز اور ہر مہینہ اور ہر سال آتے ہیں تو قرآن کریم کا بادل کس طرح ختم ہو سکتا ہے۔ جو شخص یہ سمجھے کہ گزشتہ سال بارش ہوئی تھی اور میرے والد نے کھیت کو پانی دے لیا تھا، اب مجھے پانی دینے کی ضرورت نہیں فصل خود بخود ہو جائے گی وہ احمق ہے۔ اس کے باپ نے پانی

دیا تو دانہ بھی لے لیا تھا۔ اب اگر اس نے دانہ لینا ہے تو پھر پانی بھی دینا ہوگا، ہل بھی چلانا ہوگا اور بیج بھی ڈالنا ہوگا۔ ہر سال نئے بادل آتے ہیں، نیا پانی برساتے ہیں اور نئی فصلیں اُگاتے ہیں۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کا کلام بھی ہمیشہ نئے مطالب لاتا ہے اور نئی نئی روحانی فصلیں دیتا ہے اور ان کے حصول کیلئے انسان کو ہر دفعہ نئی جدوجہد کرنی پڑتی ہے اور جو شخص سمجھتا ہے کہ اس کام سے وہ تھک گیا ہے اس کی تباہی یقینی ہے۔ مگر تم کسی اکھڑ زمیندار سے کہو کہ تم اپنی زمین میں کاشت کرتے کرتے تھک گئے ہو اب یہ میرے حوالے کر دو تو وہ لٹھ لے کر تمہیں مارنے کیلئے کھڑا ہو جائے گا کیونکہ یہ اس کے فائدہ کی بات نہیں بلکہ نقصان کی ہے۔ اسی طرح سمجھدار انسان دین کیلئے جدوجہد چھوڑنے کو کبھی منظور نہ کرے گا کیونکہ اس قربانی میں اس کا فائدہ ہے اس کا نقصان نہیں۔ جو شخص اس کام میں تھکتا ہے وہ کبھی نجات نہیں پا سکتا۔ جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ میں ایسی صورت بتا سکتا ہوں کہ روحانیت دو چار سال میں حاصل ہو جائے گی اور پھر کسی قربانی کی ضرورت نہ رہے، اس سے زیادہ جھوٹا، اس سے زیادہ مفتری اور کذاب دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ سچائی یہی ہے جو اسے سننے کی ہمت نہ رکھتا ہو وہ بے شک الگ ہو جائے کہ یہ کام نہ تم سے ختم ہو سکتا ہے نہ تمہاری نسلوں سے اور نہ ان کی نسلوں سے اور نہ یہ قیامت تک ختم ہو سکتا ہے۔ قیامت تک جو بھی پیدا ہوگا اس کی گردن پر یہ جوّا رہے گا۔ جس میں جوّا اُٹھانے کی ہمت نہیں وہ دین کے کام کا نہیں۔ ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جو منافق ہو جایا کرتے ہیں۔ جو چند روز کام کرنے کے بعد آرام کرنا چاہتے ہیں یا پنشن کے خواہاں ہوتے ہیں۔ انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ دین کے کام میں پنشن تو اگلے جہان میں ملتی ہے۔ یہاں بھی جو پنشن گورنمنٹ سے لیتے ہیں وہ دنیا کے کاموں سے علیحدہ ہو کر نہیں بیٹھ جاتے۔ گھر میں جاتے ہیں تو بچے گرد ہو جاتے ہیں، اُن کی شادیاں بیاہ کرنے ہوتے ہیں۔ پھر پوتے ہوتے ہیں اور اگر زیادہ لمبی عمر ہو تو پڑپوتے ہوتے ہیں۔ ان کے متعلق اپنے فرائض کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ گویا دنیا کے کام بھی کبھی ختم نہیں ہوتے۔ جب کوئی شخص گورنمنٹ سے پنشن لیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اب اس دفتر میں کام کا اہل نہیں۔ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ گھر پر بھی وہ اپنا کوئی کام نہیں کر سکتا۔ اور ہم نے تو دیکھا ہے کہ پنشن لینے والے عام طور پر افسروں کی دہلیز پر ہی ناک رگڑتے رہتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں صاحب! میرے لڑکے کو نوکری دلوایئے۔ کبھی پوتے کیلئے کوششیں کرتے ہیں اور کہتے ہیں صاحب! میں نے بڑی خدمت کی ہے۔ کبھی بھتیجے کیلئے یا کسی اور رشتہ دار کیلئے مارے مارے پھرتے ہیں۔ کبھی خطاب

حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور کبھی آنریری مجسٹریٹی کیلئے۔ کبھی مربعوں کیلئے افسروں کے بنگلوں کا طواف کرتے ہیں۔ غرضیکہ وہ کسی نہ کسی غرض کے ماتحت انہی افسروں کے دربار میں حاضر ہی رہتے ہیں۔ لیکن یہ نہ بھی ہو تو بھی کیا گھر کے کام کبھی ختم ہو جاتے ہیں؟ ان فکروں سے وہ کبھی آزاد نہیں ہو سکتے۔ لیکن خدا تعالیٰ کی جنت میں جو پنشن ملتی ہے اس میں کوئی فکر نہیں ہوتا۔ وہاں جو دل چاہے حاصل ہو جائے گا اور حقیقی پنشن یہی ہے۔ یا فرض کرو انسان کو خدا تعالیٰ ایسا بنا دے کہ اسے کام کرنے سے نہ کوئی تکلیف ہو نہ وہ تھکے تو وہ اگر ۴۸ گھنٹہ کام ہی کرتا چلا جائے تو اسے کیا بوجھ محسوس ہو سکتا ہے اور اگلے جہان میں جب نہ کوئی تکلیف ہوگی اور نہ تھکان تو کام بے شک ہوتا جائے اس کا کیا احساس ہو سکتا ہے۔ یا پھر جس کام کی طرف رغبت ہو اُس میں تھکان محسوس نہیں ہوتی۔

میں نے اخباروں میں پڑھا ہے کہ بعض لوگ مسلسل ۸۷ گھنٹے شطرنج کھیلتے رہے ہیں۔ کھیل میں ان کو ایسی رغبت اور شغل ہوتا ہے کہ تکلیف کا خیال تک بھی نہیں آتا اور وہ کچھ محسوس ہی نہیں کرتے۔ تو جس کام کی طرف رغبت ہو وہ بوجھ محسوس نہیں ہوتا۔ پس حقیقی پنشن وہی ہوگی جو اگلے جہان میں ملے گی۔ اس جہان میں جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ چند روز دین کا کام کرنے کے بعد پنشن مل جائے گی وہ اگر آج نہیں تو کل ضرور منافق ہوگا۔ بلکہ جو شخص اپنے لئے نہیں بلکہ اپنی اولاد کیلئے بلکہ اس کی بھی اولاد کیلئے دین کے کام میں پنشن کی توقع رکھتا ہے وہ دوسرے لفظوں میں اپنی اولاد کی بے دینی اور نظامِ دین کی تباہی کی خواہش کرتا ہے۔ دین کے کام میں پنشن ہو کیسے سکتی ہے۔ کیا نمازوں میں اللہ تعالیٰ نے آدمی کو پنشن دی ہے؟ روزہ میں دی ہے؟ طاقت کے مطابق کسی کام سے بھی پنشن نہیں دی۔ روزہ طاقت نہ ہونے کی حالت میں چھوڑا جا سکتا ہے۔ مگر یہ پنشن نہیں، یہ تو اُس وقت ہے جب آدمی روزہ رکھ ہی نہ سکے۔ پھر کوئی شخص یہ خیال کس طرح کر سکتا ہے کہ دینی نظام سے پنشن مل جائے۔ جس دن مسلمانوں نے خلافت سے پنشن لی اُسی دن سے اُن کو حقیقتاً پنشن مل گئی اور ان کی تمام ترقیات رُک گئیں۔

پہلے پچاس سالوں میں مسلمانوں نے جو حکومت حاصل کی تھی، اگلے تیرہ سَو سال میں اس سے آدھی بھی نہیں کر سکے اور یہ ایک ایسا نشان ہے جو اندھا بھی دیکھ سکتا ہے۔ پچاس سال میں ایک قوم نے اس قدر ترقیات حاصل کیں کہ بیسیوں اقوام مل کر تیرہ سَو سال میں اس سے آدھی بھی نہ کر سکیں۔ صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں ایک طرف مسلمان ہندوستان و چین کے ساحلوں تک پہنچ چکے تھے اور دوسری طرف افریقہ

کے جو حصے آباد تھے ان میں اپنی حکومت قائم کر چکے تھے اور تیسری طرف یورپ کے ساحلوں تک پہنچ چکے تھے۔ تبلیغی لحاظ سے وہ چین کے اندر تک داخل ہو چکے تھے۔ ہندوستان کے اندر بھی داخل ہو گئے تھے۔ بمبئی کے علاقہ میں تھانہ ایک بندرگاہ ہے جس کے پاس ایک گاؤں میں صحابہؓ کی قبریں موجود ہیں۔ اس مجلس میں نوے فی صدی لوگ ہوں گے جنہوں نے بمبئی نہیں دیکھا۔ حالانکہ وہ ہمارے ملک کا ایک حصہ ہے۔ پھر ریل ایجاد ہو چکی ہے جو صرف ۳۶ گھنٹے میں وہاں پہنچا دیتی ہے۔ لیکن اُس زمانہ کے لوگوں کیلئے یہ سفر کئی ماہ کا تھا مگر پھر بھی وہ یہاں پہنچے اور اپنی قبریں بھی یہیں بنا دیں۔

پس دیکھو نظام کی کتنی برکت اور طاقت تھی۔ جب تک کوئی قوم کام کی ذمہ داری سمجھتی ہے وہ ترقی کرتی جاتی ہے اور جس دن اس ذمہ واری کا احساس نہیں رہتا، ترقیات کا دروازہ بھی بند ہو جاتا ہے۔ اب میں بتاتا ہوں کہ وہ کام کیا ہے جس کیلئے اللہ تعالیٰ نے ہم کو پیدا کیا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے **اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ۔ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ** ۔[۲] یعنی اے انسانو! کچھ عقل سے کام لو۔ تم جو سمجھتے ہو ہماری زندگیاں دُنیوی ہیں دین کیلئے نہیں ہیں۔ کیا تمہیں خیال ہے کہ ہم نے دنیا کو بلا وجہ پیدا کیا ہے۔ کیا یہ ایک کھیل اور تماشہ ہے جس طرح بچے کھلونے بناتے اور پھر اسے توڑ ڈالتے ہیں۔ ہم نے بھی دنیا کو اسی طرح بنایا ہے کہ پیدا کیا اور مار دیا۔ کیا تم یہ خیال نہیں کرتے کہ بڑی عمر کا آدمی جب کوئی مکان بناتا ہے تو اسے توڑتا نہیں سوائے اس کے کہ اس میں کوئی نقص ہو اور خدا تعالیٰ کے کام میں تو کوئی نقص بھی نہیں ہوتا۔ تم ایک عمارت بناتے ہو اور پھر اسے اُس وقت توڑتے ہو جب اس سے بہتر بنانے کا خیال ہو ورنہ نہیں۔ ہاں بچے کھلونے بناتے ہیں۔ ہم جب بچے تھے ہم بھی بنایا کرتے تھے اور اب بھی بچے بناتے ہوں گے یا ممکن ہے کوئی نئے کھیل اب نکل آئے ہوں۔ بہرحال ہم اپنے بچپن کے زمانہ میں ریت کے میدانوں میں جاتے تھے اور اوپر کی خشک ریت ہٹا کر نیچے سے گیلی ریت نکال کر اُس میں پاؤں یا ہاتھ رکھ کر اوپر سے تھپکتے جاتے تھے اور اس طرح ریت کے مکان بناتے تھے۔ پھر گھر کو آتے وقت لات مار کر اُنہیں توڑ دیا کرتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم نے بھی دنیا کو بچوں کے کھیل کی طرح پیدا کیا ہے۔ یعنی ہم انسان کو پیدا کرتے ہیں اور کچھ عرصہ کے بعد اسے مار دیتے ہیں۔ گویا بچے کی کھیل کو دو گھنٹے کی ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ کی چند سال کی۔ کیا تم سمجھتے ہو ہم نے یہ سب

چیزیں لغو اور بے فائدہ پیدا کی ہیں ۔ یہ سب تماشا ہے وَ اَنَّکُمْ اِلَیْنَا لَاتُرْجَعُوْنَ ۔اور یہ کہ تمہاری موجودہ زندگی کسی اور زندگی کا پیش خیمہ نہیں ۔ اور تم سمجھتے ہو کہ پھر ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے؟ فرمایا یہ بالکل گندہ خیال ہے، اسے ہماری طرف منسوب کرنا بھی ہماری ہتک ہے ۔ کیونکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو بچہ بنادیا۔حالانکہ فَتَعٰلَی اللّٰہُ اللہ تعالیٰ کی شان اس سے بہت بلند ہے ۔ وہ کامل الصفات خدا کیا تم سمجھتے ہو کہ بچوں کی طرح کھیل رہا ہے ۔ وہ پیدا کرتا اور تباہ کرتا ہے ، نہ اس کا کوئی مقصد ہے اور نہ کوئی غرض ہے ۔فرمایا فَتَعٰلَی اللّٰہُ تم تو ایک عقلمند انسان کی طرف بھی کھیل منسوب نہیں کر سکتے کیونکہ وہ اگر کھیلے بھی تو اس کے کھیلنے کا وقت کام کے وقت کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہوتا ۔ پھر خدا تعالیٰ کی طرف جو تمام عقلوں کا پیدا کرنے والا اور علوّشان والا ہے کس طرح کہہ سکتے ہو کہ وہ محض کھیل ہی رہا ہے ۔

ہندوستان میں ایسے مذہبی فلسفی موجود ہیں جن کا خیال ہے کہ خدا تعالیٰ واقعی کھیل رہا ہے ۔ وہ کہتے ہیں یہ دنیا کیا ہے؟ یہ محض خدا تعالیٰ کی کھیل ہے ۔خدا تعالیٰ تنہائی سے گھبرایا، اس لئے اس نے کہا لاؤ کوئی شغل پیدا کریں اور اس نے انسان کو پیدا کر دیا۔کوئی انسان مرتا ہے تو وہ ہنستا ہے ۔جس طرح بچہ کھلونے کو توڑ کر ہنس دیتا ہے ۔ اس کے ماں باپ ناراض ہو رہے ہوتے ہیں مگر وہ ہنس رہا ہوتا ہے ۔ اسی طرح جب کوئی انسان مرتا ہے تو لوگ تو رو رہے ہوتے ہیں مگر خدا ہنستا ہے کہ کیا خوب گلا گھونٹا گیا ۔ اسی طرح جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو ماں دردِ زِہ کی شدت سے کراہ رہی ہوتی ہے مگر اللہ تعالیٰ ہنس رہا ہوتا ہے ۔ واقعی ایسے لوگ ہیں جو صاف لفظوں میں یہی عقائد رکھتے ہیں اور کئی ایسے ہیں جو گو منہ سے یہ نہیں کہتے لیکن ان کے اعمال کے محرکات کے پشت یہ خیال ضرور عمل کر رہا ہوتا ہے ۔ وہ سوچتے ہیں کہ ہم دنیا میں کیوں آئے ۔ اور پھر خیال کر لیتے ہیں کہ یونہی آ گئے ۔ جو لوگ اپنی زندگی کو دین کیلئے نہیں سمجھتے ان پر اگر جرح کر کے دیکھو تو ان کا عقیدہ یہی نکلے گا کہ خدا تعالیٰ کھیل رہا ہے ۔ مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ فَتَعٰلَی اللّٰہُ ۔ اللہ تعالیٰ تو بڑی شان والا ہے ۔اُس نے دنیا کو کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا بلکہ خدا کی چار صفات نے دنیا کی پیدائش کا تقاضا کیا تھا ۔ وہ صفات ظاہر ہونا چاہتی تھیں اور ان کے اظہار کیلئے ہی اس نے دنیا کو پیدا کیا ۔ وہ چار صفات کیا ہیں ۔اَلْمَلِکُ - اَلْحَقُّ - لَآاِلٰہَ اِلَّا ھُوَ - رَبُّ الْعَرْشِ الْکَرِیْمِ ۔ فرمایا اللہ تعالیٰ مَلِک ہے ۔ اس کی ملکیت چاہتی تھی کہ ظاہر ہو ۔ وہ اَلْحَقُّ ہے اس کا حق ہونا چاہتا تھا کہ ظاہر ہو ۔ لَااِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اس کی توحید یہ چاہتی تھی کہ ظاہر ہو ۔ اور اس کا رَبُّ الْعَرْشِ الْکَرِیْمِ ہونا

چاہتا تھا کہ ظاہر ہو۔ یہ چاروں صفات اپنا اظہار چاہتی تھیں اس لئے اس نے دنیا کو پیدا کیا۔ ان چاروں صفات پر غور کرو تو یہ وہی ہیں جو سورۂ فاتحہ میں بیان کی گئی ہیں۔ وہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۔ [۳] یعنی اللہ تعالیٰ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ الرَّحْمٰنِ ہے الرَّحِیْمِ اور مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ہے۔ یہاں بھی وہی چاروں صفات بیان کی گئی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ترتیب بدل دی گئی ہے۔ سورۂ فاتحہ میں جو پہلے بیان کی تھی یہاں وہ آخر میں رکھ دی۔ پھر اسی ترتیب سے سب صفات کو اُلٹ کر رکھ دیا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں اَلْمَلِکُ جو آیا ہے یہ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ کی طرف اشارہ ہے۔ علم القرأت سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ کی جگہ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ پڑھا ہے۔ غرض اَلْمَلِکُ کا لفظ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ سورۂ فاتحہ میں مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ سے پہلے الرَّحِیْمِ ہے۔ یہاں اَلْمَلِکُ کے بعد اَلْحَقُّ رکھا گیا ہے۔ سورۂ فاتحہ میں الرَّحِیْمِ سے پہلے اَلرَّحْمٰنِ ہے۔ یہاں اَلْحَقُّ کے بعد اس کی طرف اشارہ کرنے کیلئے لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ رکھا گیا ہے۔ سورۂ فاتحہ میں اَلرَّحمٰنِ سے پہلے رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ہے۔ یہاں اس کی جگہ سب سے آخر میں رَبُّ الْعَرْشِ الْکَرِیْمِ رکھا گیا ہے۔ گویا سورۂ فاتحہ کی مذکورہ صفات اور اس آیت مذکورہ صفات میں صرف یہ فرق ہے کہ ایک تو ترتیب اُلٹ دی ہے دوسرے درمیانی دو صفات کو دوسرے الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔ یعنی رحیمیت کی طرف اشارہ اَلْحَقُّ سے اور رحمانیت کی طرف اشارہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ سے کیا گیا ہے۔ غرض یہ صفات وہی سورۂ فاتحہ والی صفات ہیں۔ مزید تشریح کیلئے مَیں یہ بتا دیتا ہوں کہ مَلِک بادشاہ کو کہتے ہیں اور ملکیت مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ کی ذات کے ظہور کا موجب اور منبع ہے کیونکہ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ کے معنی ہیں جزا سزا کے دن کا مالک۔ اور جزا سزا مترتب نہیں ہوسکتی جب تک اس کے پہلے کوئی قانون نہ ہو۔ چنانچہ اگر ہماری شریعت میں نماز کا حکم نہ ہوتا تو کیا ہم مسلمانوں سے یہ پوچھ سکتے تھے کہ تم نمازیں کیوں نہیں پڑھتے؟ اگر ہم ایسا کرتے تو یقیناً وہ جواب دیتے کہ ہمیں ایسا کوئی خاص حکم نہیں ہے۔ غرض جسے حکم نہ ہو اُس سے رپورٹ بھی نہیں لی جاتی اور ایسا شخص مجرم بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پس مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ نتیجہ ہے ملکیت کا۔ کیونکہ پہلے قانون کا نفاذ ہو پھر اس کے متعلق جواب طلبی ہوسکتی ہے۔ مَلِک کے بعد اس سورۃ میں اَلْحَقُّ کی صفت بیان کی گئی ہے اور ادنیٰ غور سے معلوم ہوسکتا ہے کہ اَلْحَقُّ رحیمیت کا منبع

ہے۔ کیونکہ جب مَـلِک کی طرف سے قانون جاری کیا جائے تو اس کے ساتھ انعام اور صلے بھی جاری ہوتے ہیں اور ان کے وعدے کئے جاتے ہیں اور رحیم کے معنے یہی ہیں کہ اچھے کاموں کا اعلیٰ سے اعلیٰ بدلہ دیتا ہے۔ کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتا اور یہ اَلْحَقُّ کی صفت کا تقاضا ہے۔ کیونکہ اَلْحَقُّ چاہتا ہے کہ اس کا کوئی وعدہ غلط نہ جائے اور جو جو اس نے لوگوں سے انعامات کے وعدے کئے ہیں ان کو ضرور مل جائیں۔ پھر اَلْحَقُّ کے معنے قائم رہنے اور قائم رکھنے کے بھی ہوتے ہیں۔ اور رحیم کی صفت میں جو بار بار بدلہ دینے کے معنے پائے جاتے ہیں وہ اسی صفت سے تعلق رکھتے ہیں۔ کیونکہ اَلْحَقُّ نہ صرف خود قائم رہتا ہے بلکہ وہ دوسروں کو بھی قائم رکھتا ہے۔ اور انعامات کو بھی قائم رکھتا ہے۔ حق درحقیقت مصدر ہے اور مصدر مبالغہ کے معنوں کے ساتھ اسم فاعل کے معنی بھی دے دیتا ہے۔ جیسے اَلْعَدْل نہایت انصاف کرنے والے کو کہتے ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی کہتے ہیں کہ فلاں شخص تو رحم ہی رحم ہے یعنی بہت رحم کرنیوالا ہے۔ پس اَلْحَقُّ کے معنی اس کے مختلف معنوں کے رو سے قائم رہنے والے، قائم رکھنے والے اور سچے وعدے کرنے والے کے ہوں گے اور چونکہ رحیم کے معنے کسی کے نیک کام کو ضائع نہ کرنے کے اور متواتر انعامات دینے کے ہیں، اس صفت کا تعلق اَلْحَقُّ سے ہے۔ اَلْحَقُّ ہی ہے جو دیکھتا ہے کہ کوئی وعدہ غلط نہ ہو اور اس کے مورد صرف ایک دفعہ ہی انعام نہ پائیں بلکہ انعام پاتے جائیں اور دائمی زندگی ان کو عطا ہو۔ غرض مزدوری کا تعلق اَلْحَقُّ سے ہے کیونکہ وعدے آئندہ کیلئے ہی ہوتے ہیں اور کام کے بعد پورے کئے جاتے ہیں۔ مگر بخشش پہلے ہوتی ہے۔ کوئی فقیر آتا ہے تو انسان فوراً اسے روٹی دے دیتا ہے۔ کسی محتاج کو دیکھتا ہے تو پیسے دے دیتا ہے۔ مگر اولاد اور دوستوں کیلئے وعدے ہوتے ہیں۔ پہلے ان کے سپرد خدمات کی جاتی ہیں۔ پس اَلْحَقُّ کا تعلق رحیمیت سے ہے۔

پھر فرمایا لَآاِلٰـهَ اِلَّا هُوَ یہ رحمانیت کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ رحمانیت کا تقاضا ہے کہ ہر زمانہ میں ہر ایک کی ضرورتیں پوری ہوں خواہ کوئی کام کرے یا نہ کرے اور یہ توحیدِ الٰہی کی ایک دلیل ہے کیونکہ بغیر کسی شگاف یا وقفہ کے سب کی ضرورتیں پوری ہو رہی ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ کوئی بچہ پیدا ہوا ہو اور اس کیلئے دودھ کی ضرورت پوری نہ ہو۔ نادان خیال کرتا ہے کہ یہ دودھ آج پیدا ہوا ہے۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ جس وقت دنیا کی پیدائش ہوئی اُسی وقت زید یا بکر کا دودھ بھی پیدا ہوا تھا۔ یہ چھاتی کا دودھ ماں کے خون سے پیدا ہوا ہے اور خون ان جمادی حیوانی یا نباتی غذاؤں سے جو انسان کھاتا ہے اور ان میں

سے بعض چیزیں لاکھوں سال پہلے بنائی گئی تھیں اور بعض گو بظاہر اب پیدا ہوتی ہیں لیکن ان کی پیدائش کے ذرائع پہلے کے ہی ہیں۔ جیسے سبزیاں، ترکاریاں کہ ان کو بیج زمین اور پانی پیدا کرتا ہے۔ اگر یہ چیزیں نہ ہوتیں تو دودھ کہاں سے آ سکتا تھا۔ پس اس کے سامان اُس وقت رکھے گئے تھے جب دنیا کا پہلا ذرہ پیدا ہوا تھا۔ پس رحمانیت لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ پر دلالت کرتی ہے اور اسے مانتے ہوئے دوسرا خدا انسان تسلیم ہی نہیں کرسکتا۔ کامل توحید انہی قوموں میں ہے جو خدا تعالیٰ کی رحمانیت کی قائل ہیں۔ ہندو اور مسیحی مشرک قومیں ہیں اور یہ دونوں رحمانیت کی قائل نہیں۔ ایک نے رحمانیت کا انکار کرکے تناسخ کا مسئلہ نکالا ہے تو دوسری قوم نے کفارہ ایجاد کیا ہے۔ غرض شرک اور رحمانیت ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتے، توحید کامل رحمانیت سے تعلق رکھتی ہے۔ رحمانیت کے معنے ہیں کہ انسان کی ہر ضرورت پوری ہو خواہ اس نے اس کیلئے کام کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ اب یہ بات تب ہی ہوسکتی ہے جب ایک خدا ہو۔ کیونکہ جس نے خواہشات پیدا کیں وہی ان کو پورا کرنے کے سامان پیدا کرسکتا ہے اور جب ایک وجود نے خواہشات بھی پیدا کیں اور انہیں پورا بھی کردیا تو اب کسی دوسرے وجود کی ضرورت کیا رہی۔

مجھے اس حقیقت کے متعلق ایک واقعہ یاد آ گیا ہے اسے بیان کردیتا ہوں۔ میں ایک دفعہ ڈلہوزی گیا میری عمر بھی اچھوٹی ہی تھی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کی خلافت کے ابتدائی ایام تھے اُس وقت وہاں عیسائیوں کے ایک بڑے پادری ینگسن نامی جنہوں نے سیالکوٹ کا مشن قائم کیا تھا، آئے ہوئے تھے۔ اُن کی عمر کوئی ستّر سال کی تھی اور داڑھی انہوں نے خوب بڑھائی ہوئی تھی۔ وہ پادری صاحب عیسائیوں میں بہت معزز تھے۔ پنجاب سے ان کی تبدیلی آخر عمر میں پونا کو ہوگئی تھی اور وہیں سے خرابی صحت کی وجہ سے وہ ڈلہوزی آئے تھے۔ وہ بعض دفعہ اپنے مذہبی اشتہار بازاروں میں تقسیم کیا کرتے تھے۔ بعض دوستوں کی خواہش تھی کہ میں ان سے بات چیت کروں۔ چنانچہ میں اُن سے ملا دورانِ گفتگو میں بعض باتیں اس مضمون کے متعلق ہوئیں جس کو میں اب بیان کررہا ہوں۔ توحید کا مسئلہ زیر بحث تھا۔ میں نے اُن سے پوچھا بتایئے اللہ تعالیٰ مخلوقات کو خود پیدا کرنے پر قادر ہے یا نہیں؟ انہوں نے کہا ہاں۔ میں نے کہا بیٹا؟ انہوں نے کہا ہاں۔ میں نے پھر روح القدس کے بارہ میں پوچھا انہوں نے کہا وہ بھی پیدا کرسکتا ہے۔ مگر خدا نے یہ کام بیٹے کے سپرد کیا۔ میں نے کہا پھر تو خدا تعالیٰ اور روح القدس سارا وقت فارغ رہتے ہوں گے۔ ان کے وجود یا عدمِ وجود کا کوئی فائدہ ہی نہیں۔ کہنے لگے نہیں سب ہی کام کرتے

ہیں۔ میں نے کہا یہ سامنے آپ کی پنسل پڑی ہے۔ اگر کوئی بات نوٹ کرنے کیلئے آپ اسے اُٹھانا چاہیں تو کیا آپ اپنے بیرے، خانسامہ اور اپنے دوست کو جو آپ کے ساتھ ہیں بلکہ مجھے بھی مدد کیلئے بلائیں گے اور اگر اتنے آدمی مل کر پنسل پر اُنگلیاں رکھیں اور سب اُٹھا کر اسے آپ کے قریب کریں تو دیکھنے والا ہم سب کو پاگل سمجھے گا یا نہیں؟ کہنے لگے ضرور سمجھے گا کیونکہ پنسل کو تو ایک آدمی بھی بآسانی اُٹھا سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ جب یہ بات ہے اور آپ مانتے ہیں کہ ایک خدا بھی سب کچھ کرسکتا ہے تو پھر باقیوں کی ضرورت کیا ہے۔ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ جب ایک انسان بلا ضرورت کسی کام پر زائد آدمی لگائے تو اسے آپ پاگل کہیں مگر ان کو آپ ہم سے خدا منوانا چاہتے ہیں جو ہر ایک کامل قدرت رکھنے کے باوجود ایک چھوٹے کام کیلئے تین مل کر لگے ہوئے ہیں۔ تو رحمانیت کو مانتے ہوئے شرک کبھی قائم نہیں رہ سکتا۔ رحمانیت کے معنے یہ ہیں کہ اس کی رحمت سے کوئی باہر نہیں اور جو بغیر محنت کے دیتا ہے اس کی رحمت سے کون باہر رہ سکتا ہے اور جب وہ ہر ایک کی ضرورت کو ہر زمانہ میں پورا کرتا ہے تو پھر دوسرے خدا نے کیا کرنا ہے۔ جس قوم میں کامل توحید نہیں وہ خدا کی رحمانیت کی قائل نہیں ہوسکتی۔

پھر فرمایا رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ یعنی وہ تمام صفاتِ حسنہ کا مرکز اور حکومت کا مالک ہے۔ اس کا عرش کریم اور کریم اسے کہتے ہیں جس میں اعزاز اور احسان پایا جاتا ہو اور ساری عزتیں اور سارے احسان اس میں جمع ہوں۔ وہ ربوبیت میں ادنیٰ حالت سے لے کر اعلیٰ تک ترقی دیتا ہے۔ وہ بے شک بادشاہ بھی ہے مگر انسانوں کی نظامی ضرورتوں کے علاوہ وہ ان کی تربیت کے متعلق ضرورتیں بھی پوری کرتا ہے۔ بادشاہت تو صرف انتظامی ضرورتوں تک ہوتی ہے۔ انفرادی تعلقات کی درستی ربوبیت کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ بادشاہ کو میاں بیوی کے باہمی جھگڑے سے کوئی سروکار نہیں ہوتا مگر ربوبیت کو اس کے ساتھ تعلق ہے۔ ماں باپ انہیں ضرور کہیں گے کہ لڑو نہیں۔ تو ربوبیت کا تعلق تمدنی اور معاشی چیزوں سے ہے۔ اس لئے فرمایا کہ اس کی بادشاہت خالی ملوک والی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ربوبیت بھی شامل ہے۔ یعنی تمدنی اور معاشی امور سے بھی اسے وابستگی ہے اور کریمیت بھی اس کے ساتھ ہے۔ خدا تعالیٰ کی یہ چاروں صفات وہ ہیں جن کی وجہ سے دنیا ظہور میں آئی۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ وہ اس لئے ہے کہ وہ مٰلک ہے۔ رَحیم اس لئے ہے کہ وہ اَلْحَقُّ ہے۔ رحمٰن اس لئے ہے کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ہے۔ جہاں ایک سے زیادہ کام کرنے والے ہوں وہاں کسی سے پوچھو کہ فلاں کام تم نے کیوں نہیں کیا۔ تو وہ

جواب دے دیتا ہے کہ میں نے سمجھا فلاں کر لے گا۔لیکن جب کام کرنے والا ایک ہی ہوتو وہ خود ساری فکر رکھتا ہے۔اس طرح خدا تعالیٰ جانتا ہے کہ اور تو کوئی ہے نہیں، میں نے ہی سب کی ضرورتوں اور سب ضرورتوں کو پورا کرنا ہے۔ پس اُس کا رحم ہر رنگ میں ظاہر ہوتا ہے۔ پھر وہ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اور رَبُّ الْعَرْشِ الْکَرِیْمِ ہے۔ یہ چاروں چیزیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ دنیا میں قائم کرنی ہیں۔اور اسی غرض کیلئے ہم نے بندے کو پیدا کیا ہے اور مذہب دنیا میں اسی لئے آتا ہے کہ ان چیزوں کو قائم کرے۔ ملکیت نظامِ کامل پر دلالت کرتی ہے۔ بادشاہ یا خلیفہ کا کام ہے کہ دُنیوی یا دینی نظام کو قائم رکھے اور ایک کو دوسرے پر ظلم نہ کرنے دے اور خدا تعالیٰ کی ملکیت تقاضا کرتی ہے کہ بنی نوع انسان میں نظام ہو اسی لئے انسان کو مدنی الطبع بنایا ہے اور اسے مل جل کر رہنے پر مجبور کیا ہے۔ بیوی بچے ساتھ لگا دیئے ہیں۔ بیشک وہ جانوروں کے ساتھ بھی ہیں مگر اس طرح نہیں جس طرح انسان کے ساتھ ہیں۔بعض جانوروں میں تو جوڑا ہے ہی نہیں۔بعض میں ہے جیسے کبوتر مگر ان میں بھی تربیت اولاد کا طریق نہیں۔ بچہ جب دانے کھانے لگے نکال دیتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوگا کہ بچہ کو بوڑھا ہونے تک باپ ساتھ لئے پھرے۔ لیکن انسان میں یہ بات ہے۔ اِسی جلسہ پر دو بوڑھے آدمی مجھے ملنے آئے۔ایک زیادہ ضعیف تھا اور دوسرا اسے سہارا دے کر لا رہا تھا۔ میں نے خیال کیا یہ بھائی بھائی ہیں اور ان سے دریافت کیا کہ کیا آپ دونوں بھائی ہیں؟ اِس پر اُس نے جو سہارا دے کر دوسرے کو لا رہا تھا کہا کہ نہیں جی یہ میرا بیٹا ہے۔ بوجہ امراض کے زیادہ بوڑھا معلوم ہوتا ہے اور چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا ہے اس لئے میں اسے اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔ ایسی مثالیں جانوروں میں نہیں پائی جاتیں تو انسان کو مدنی الطبع بنایا گیا ہے۔ پھر جانوروں میں بھائیوں کا احساس نہیں۔ برادری کا سسٹم ان میں کوئی نہیں لیکن اگر بعض کے تعاون کو جیسا کہ چیونٹیوں میں ہوتا ہے برادری کا طریق سمجھ لیا جائے تو خاندان کی مثال ان میں نہیں مل سکے گی۔ حکومت تو ہوگی جیسے شہد کی مکھیوں میں اور چیونٹیوں میں ہوتی ہے مگر خاندان کا سسٹم نہیں ہوگا۔اور وارث ہونا قرابیت کی وجہ سے دوسرے کا ذمہ وار قرار پانا یہ باتیں مفقود ہوں گی۔ پس ملکیت کامل نظام پر دلالت کرتی ہے اور اسی لئے انسان کو اللہ تعالیٰ نے مدنی الطبع پیدا کیا ہے۔

خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ دنیا میں نظام کامل پیدا کیا جائے۔جس وقت تک حکومتیں مسلمان اور احمدی نہیں ہو جاتیں جو کامل طور پر نظام کے قیام کا ذریعہ ہیں اُس وقت تک جتنا اسلامی نظام بھی ممکن ہو

ہمیں اسے قائم رکھنا چاہئے۔ پھر صفت اَلْحَقُّ جو ہے یہ اخلاقِ فاضلہ اور عمل کی درستی پر دلالت کرتی ہے۔ رحیمیت کے معنے ہیں اچھے کام کا بدلہ دینا اور یہ چیزیں اخلاق سے تعلق رکھتی ہیں۔ اچھے کام ہوں تو بدلہ دیا جاسکتا ہے ورنہ نہیں اور جس طرح ملکیت کے نظام کو قبول کرنے کیلئے انسان کے اندر قابلیت رکھی تھی اور اسے مدنی الطبع بنایا تھا، اسی طرح اَلْحَقُّ کے مقابلہ پر اخلاقِ فاضلہ انسان کو دیئے ہیں۔ مذاہب ہو یا نہ ہو، تعلیم ہو یا نہ ہو، تمدن ہو یا نہ ہو، اخلاق سے کورا کوئی انسان نہیں ہوسکتا۔ ذرا خلافِ اخلاق بات کر کے دیکھو فوراً چہرہ سُرخ ہوجائے گا اور پسینہ بہنے لگے گا۔ جس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ فطرت بول رہی ہے۔ رسول کریم ﷺ نے بھی فرمایا ہے کہ کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلٰی فِطْرَۃِ الْاِسْلَامِ [۴] یہاں اسلام سے مرا یہ اسلام نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قانونِ حقہ کی فرمانبرداری بچہ میں پائی جاتی ہے۔ اسی فطرت پر بچہ پیدا ہوتا ہے۔ بعد میں اس کے ماں باپ اپنے رنگ میں رنگین کر لیتے ہیں۔ جھوٹ بولنے کی عادت پڑ جائے تو بے شک انسان بے حیا ہوجاتا ہے لیکن پہلا جھوٹ بولتے ہوئے اُس کا رنگ ضرور فق ہوگا کیونکہ اُس کی فطرت میں سچائی ہے۔ بے شک کسی کو چوری کی اتنی عادت ہوجائے کہ وہ سب مال سمیٹ کر اپنے قبضہ میں کر لینے کی حرص رکھتا ہو مگر پہلی چوری کرتے ہوئے ضرور اُس کا ہاتھ کانپا ہوگا۔ کیونکہ اخلاقِ فاضلہ کو اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت میں داخل کیا ہے۔ جب خدا تعالیٰ بدلہ دینا چاہتا تھا تو اس کیلئے جس چیز کی ضرورت تھی وہ بھی ہونی چاہئے تھی۔

لَآاِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ کے ساتھ قربانی اور ایثار کا تعلق ہے۔ رحمانیت کا یہی مطلب ہے کہ بغیر مزدوری کے دیا جائے۔ یہ چیز بھی انسان کی فطرت میں رکھی گئی ہے۔ اس کی مثال ماں باپ میں ملتی ہے۔ وہ قطع نظر اس خیال سے کہ بچہ کبھی ان کے کام آئے گا یا نہیں، اسے پالتے پوستے ہیں، اسے تعلیم دلاتے ہیں اور یہ سب کچھ اس کی طرف سے کسی محنت کے بغیر یا بدلہ کی امید کے بغیر کرتے ہیں۔ ہاں جو لوگ پیدائش میں کامل نہ ہوں وہ اخلاق میں بھی کامل نہیں ہوسکتے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی ہیجڑا بزرگ نہیں ہوا۔ وہ چونکہ کامل الخلق نہیں ہوتا اس لئے کامل الاخلاق بھی نہیں ہوسکتا۔ کامل الاخلاق ہونے کیلئے کامل الخلق ہونا ضروری ہے۔ اس نکتہ کو علمِ نفس والوں نے خوب سمجھا ہے اور ایک نے تو اسے ایسے لطیف رنگ میں بیان کیا ہے کہ اس کا خیال الہام کی حد تک پہنچ گیا ہے۔

امریکہ کے ایک شخص نے علم النفس کے متعلق سات جلدوں میں ایک کتاب لکھی ہے۔ اس میں

Seanality کی تاریخ بیان کرتے ہوئے وہ کثرتِ ازدواج کی طرف بھی آیا ہے۔ اور پھر اِس ضمن میں رسول کریم ﷺ کا ذکر بھی اُس نے کیا ہے اور عیسائی ہونے کے باوجود وہ لکھتا ہے کہ میں اُن لوگوں کو احمق سمجھتا ہوں جو آپؐ کے ایک سے زیادہ بیویاں کرنے پر اعتراض کرتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو اپنے اندر جذب کرنے والا شخص یقیناً ایسا کامل الخلق ہوتا ہے اور اس کے اندر ایسی طاقتیں ہوتی ہیں کہ وہ یہ بوجھ اُٹھا سکتا ہے۔ کامل الخلق ہونے کے یہ معنے نہیں کہ ضرور بہت ہٹا کٹا ہی ہو بلکہ اس سے مراد صفات حسنہ اور دل دماغ کی طاقت ہے۔ پھر لَآاِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ میں توکّل پایا جاتا ہے، یہ بھی لَآاِلٰـہَ کا پرتو ہے۔ جانور میں بڑا توکّل ہوتا ہے مگر وہ انسان کے توکّل کو پھر بھی نہیں پہنچ سکتا۔ چند روز ہوئے میں گھر میں کھانا کھا رہا تھا اور وہیں ایک بلی بھی پھر رہی تھی جس سے میری بیوی کے دل میں کچھ خفگی کے جذبات پیدا ہو رہے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ دیکھو خدا کی قدرت ہے کہ اس نے بہت سے جاندار پیدا کئے اور ان میں سے صرف ایک کو کہا کہ میں تجھے بے انتہاء دوں گا اور باقیوں کو نہیں کہا مگر عجیب بات ہے کہ جسے کہا تھا وہ تو خدا کو چھوڑ کر اپنی محنت کرنے لگ گئے اور جن سے نہیں کہا تھا وہ توکّل کر کے بیٹھے ہیں۔ پھر دوسرے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو سب جانداروں میں سے صرف ایک ہی ہے جو کماتا ہے اور وہی بھوکا مرتا ہے۔ مگر یہ تو ایمان سے محروم انسانوں کی کمزوری ہے۔ ورنہ حقیقت یہی ہے کہ کامل توکّل کی طاقت انسان میں ہی پائی جاتی ہے۔ جانوروں میں کوئی نہیں ہوگا جو بیٹھ جائے کہ بس اب خدا ضرور بھیج دے گا۔ مگر انسانوں میں ایسے ضرور ملیں گے اور ہزاروں ہوں گے جن کیلئے اللہ تعالیٰ اپنے پاس سے سامان کرتا ہے۔ تو توکّل کا مقامِ کامل بھی انسان کو ہی ملتا ہے۔ گو ہر ایک کا یہ کام نہیں کہ توکّل کے مقام والے کی نقل کرے۔ کہتے ہیں کوئی بزرگ تھے جو کام نہیں کرتے تھے۔ دوسرے بزرگ انہیں نصیحت کرنے کیلئے آئے کہ کوئی کام بھی کرنا چاہیئے۔ توکّل کرنے والے توکّل کے مقام پر تھے مگر دوسرے بزرگ کا مقام دوسرا تھا اس لئے انہوں نے جب نصیحت کی تو اس بزرگ نے کہا کہ میں تو اللہ تعالیٰ کا مہمان ہوں اور یہ میزبان کی ہتک ہے کہ اُس کا مہمان کوئی کام کرے۔ دوسرے بزرگ نے کہا کہ مانا آپ مہمان ہیں مگر رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ مہمانی تین دن کی ہے۔[5] اس کے بعد سوال ہو جاتا ہے۔ یہ سن کر وہ متوکل بزرگ کہنے لگے کہ اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ [6] خدا تعالیٰ کا دن قرآن کریم کے مطابق ایک ہزار سال کا ہوتا ہے۔ پس مہمان نوازی کی مدت تین

ہزار سال کی ہے۔ اس کے بعد اگر زندہ رہے تو دیکھا جائے گا۔

اسی طرح ایک اور بزرگ جو اِس مقام پر تھے اُن کی نسبت لکھا ہے کہ ان کے ذمہ کچھ قرض ہوگیا۔ اُن کا قرض خواہ اُن کے پاس آیا اور انہیں تنگ کرنے لگا اور فوری ادائیگی کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے کہا بیٹھو! ابھی خداتعالیٰ کی طرف سے رقم آ رہی ہوگی۔ مگر وہ شخص مصر تھا کہ ابھی رقم دو میں انتظار نہیں کرسکتا۔ اِسی دوران میں ایک لڑکا گزرا جو حلوا فروخت کررہا تھا۔ اُس بزرگ نے اُسے بُلایا اور اس سے حلوا لے کر حاضرین کو کھلایا۔ حلوا کھا کر تھوڑی دیر کیلئے اس کا منہ تو بند ہوا مگر جب اس لڑکے نے کہا کہ لایئے آٹھ آنہ کے پیسے تا میں جاؤں تو اُس بزرگ نے کہا کہ تم بھی بیٹھ جاؤ اللہ تعالیٰ ابھی بھیجتا ہے۔ اس پر وہ شخص کہنے لگا کہ یہ آپ نے کیا کیا؟ میرا قرض تو دبایا ہی ہوا تھا اب اس لڑکے کا بھی دبالیا۔ اتنے میں ایک شخص آیا اس نے کاغذ میں لپٹی ہوئی نقدی دی اور کہا کہ یہ فلاں شخص نے آپ کو نذر بھیجی ہے۔ اسے کھولا تو جتنا قرض تھا اُتنی ہی رقم اُس میں موجود تھی مگر حلوے والے کے پیسے نہیں تھے۔ اِس پر اُس بزرگ نے کہا کہ تمہیں غلطی لگی ہے، کچھ اور بھی ہے۔ اِس پر اُس نے کہا کہ ہاں مجھ سے غلطی ہوئی مجھے بھول گیا تھا اس کے ساتھ ایک اٹھنی بھی ہے۔ تو توکّل کا یہ مقام انسانوں میں سے ہی بعض کو حاصل ہوتا ہے۔

رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ۔ تنظیمِ معاشی، تنظیمِ تعلیم اور تربیت کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ دیکھ لو ایک باپ کس طرح کھانے پینے کا بوجھ اُٹھانے کے ساتھ ساتھ بچہ کو تعلیم بھی دلواتا ہے اور اس کی اصلاح کا بھی خیال رکھتا ہے۔ یہ سب استعدادیں مجموعی طور پر اللہ تعالیٰ نے انسان ہی کے اندر رکھی ہیں اور مذہب ان خفیہ استعدادوں کو جگانے کیلئے اور انہیں منظّم صورت میں قائم کرنے کیلئے آتا ہے۔ یہی چیز ہے جس کیلئے احمدیت کو اللہ تعالیٰ نے قائم کیا ہے۔ یہ کام ہم نے کرنے ہیں اور اگر انہیں نہیں کرتے تو اس کے صاف معنے یہ ہیں کہ ہم نے اپنے رستہ کو چھوڑ دیا ہے۔ لیکن اب چونکہ وقت زیادہ ہوگیا ہے اس لئے اس مضمون کی مزید تفاصیل آئندہ خطبہ میں اِنْشَاءَ اللّٰهُ بیان کروں گا۔ وَمَا تَوْفِيْقِىْ اِلَّا بِاللّٰهِ

(الفضل ۲۶ر نومبر ۱۹۳۷ء)

---

[۱] اسد الغابة جلد ا صفحہ ۱۲۸۔ مطبوعہ ریاض ۱۲۸۴ھ

۲ المؤمنون: ۱۱۶، ۱۱۷ ۳ الفاتحہ: ۲ تا ۴

۴ بخاری کتاب الجنائز باب ما قیل فی اولاد المشرکین

۵ بخاری کتاب الادب باب اکرام الضیف ......(الخ)

۶ الحج: ۴۸